ربّانی اخلاقیات کیوں مطلوب ہیں

مؤلف

الحاج قاری محمد ارشاد علی

مولوی عالم (نظامیہ) بی۔کام (عثمانیہ)

تفصیلات طباعت

نام کتاب	ربّانی اخلاقیات کیوں مطلوب ہیں
مؤلف	الحاج قاری محمد ارشاد علی
صفحات	۱۸
اشاعت	جون ۲۰۰۷
قیمت	مُفت
اہتمام	صاحبزادہ محمد طاہر علی
ای میل	islahitohfa@gmail.com

مزید موضوعات

http://archive.org/details/@islahi_tohfa

تنبیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس دنیا میں ربّانی اخلاقیات کیوں مطلوب ہیں

اللہ کے اخلاق اختیار کرو

وہ کریم ہے تم کریم بنو، وہ رحیم ہے تو تم بھی رحیم بنو۔ وہ حفیظ ہے تو تم بھی اپنوں کی نگرانی کرو، وہ معطی (عطا کرنیوالا) ہے تو تم بھی فقیروں کو عطا کرو، اس طرح اللہ کے کمالات (صفات) سے مُتَکَمِّل (متصف) ہو جاؤ۔

اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ متکبّر بھی تو اُسی کی صفت ہے اور شان ہے۔اِس میں بھی تَخَلُّق (adaptability) ہونا چاہیے یا نہیں۔اِسکا جواب دو طریقہ سے ہے۔ ایک یہ کہ تکبّر کرنا معاذاللہ بُری بات نہیں ہے اور نہ کِبر بُری چیز ہے۔ اسلئے کہ وہ صفت خداوندی ہے۔ البتہ جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں بڑا ہوں تو یہ جھوٹ ہے اسلئے جھوٹ سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ انسان محتاج اور عدم اور عیوب کا مجموعہ ہے۔ وہ بڑا نہیں ہو سکتا اور تکبّر اسکے لئے سزاوار نہیں ہے۔ یہ تو اللہ ہی فرما سکتا ہے کہ اَنَا الکَبِیْرُ اَنَا الْمُتَحَالُ لِي العَظمَةُ وغیرہ

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ کِبریائی صفت ذات سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ صفت افعال سے ۔ صفات افعال میں اگر ہم تَخَلُّق کریں تو اسکا حکم ہے لیکن صفت ذات میں نہیں۔ جیسے خالقیت میں کوئی تَخَلُّق کرے تو یہ ذات کی برابری ہوتی ہے۔اِسی طرح تکبر کا معاملہ ہے کہ اُس کا تعلق بھی اللہ کی ذات ہی سے ہے اِسکی اجازت انسان کیلئے نہیں ہے ۔ تکبر کرنے والا ہمیشہ محروم رہتا ہے کیونکہ وہ جھوٹا ہوتا ہے اس لئے تکبر کرنا جھوٹ بولنا ہے۔اِسی لئے تکبر کی اجازت نہیں ہے۔

انسان سے ربانی اخلاقیات کیوں مطلوب ہیں؟ اور کیوں خدا نے اپنی ہدایت (قرآن) بھیجی اور کائنات میں بڑے پیمانے پر کیوں اُسکے عملی مظاہرے کا انتظام کیا؟۔ تاکہ آدمی خدا کی کتاب میں جس چیز کو پڑھے اسکو عملی نمونے کی صورت میں اپنے باہر دیکھ لے اور پھر اُسکے لئے اُس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

اسبات کو پوری طرح سے سمجھنے کیلیئے خدا کی اسکیم کو سمجھنا پڑیگا۔ جسکی خاطر یہ ساری دنیا بسائی گئی۔

خدا نے ایک ابدی جنت بنائی اور مذکورہ اخلاقیات اُس جنت کے رہنے والوں کے اخلاقیات (اوصاف) ہیں۔ انسان اگر اپنے لئے ایک پُر مَسَرَّت اور کامیاب زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ خدائی اسکیم کے مطابق کر کے ہی اِسکو پا سکتا ہے۔ جو چیز آج ہے وہ کھل نہیں مل سکتی اور جو چیز کل ملنے والی ہے اسکو آج پانے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ انہیں دو لفظوں میں زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔

تَضاد (اختلاف) صرف انسان کی طرف سے ہے

اس کائنات میں چڑیا صرف وہی آواز نکالتی ہے جو اُسکے خالق نے اُسکو سکھایا ہے۔ یہاں بلّی اور بکری صرف اُسی طرح رزق کھاتے ہیں جو پیدائشی طور پر اُنکے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ درخت بھی اُسی طرح منصوبہ خداوندی کے پابند ہیں جس طرح خالق نے انھیں پابند کر دیا۔ دریاء بھی اُسی طرح رواں ہیں جسطرح ہونا چاہیے۔

مگر انسان کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ وہ اپنے منھ سے ایسی آوازیں نکالتا ہے جسکی اجازت اُسکے خالق نے اُسکو نہیں دی اور وہ ایسی چیزوں کو اپنی غذا بنا رکھا ہے جس سے اُس کے مالک نے اُسکو روک رکھا ہے۔ اور وہ ایسا سفر اختیار کرتا

ہے جس سے اُسکے مالک نے اُسکو منع کیا ہے۔ تقدیر کے پابند نباتات و جمادرت، مؤمن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند۔

ہم آہنگی میں بے آہنگی انسان کی طرف سے ہے

خدا کی کائنات میں ایک سیارہ زمین ہے جو ایک حقیر حیثیت رکھتا ہے۔ اِس عظیم کائنات کی مناسبت سے پھر زمین پر ۶۹ فیصد یا ۷۰ فیصد حصّہ پانی سے ڈھپا ہوا ہے بقیہ حصّے میں حشرات الارض، پرند چرند، درند، جنگل، پہاڑ، دریا، ندی، جھیل وغیرہ ہیں۔ بڑے بڑے صحراء ہیں ریگلستان ہیں، اب جو حصّہ آباد کاری کے قابل ہے اُس میں انسان آباد ہے۔ اس طرح انسان، خدا کی کائنات کا بہت چھوٹا حصّہ ہے۔ اسپر بھی وہ عظیم کائنات کے مجموعی نظام سے بغاوت کرتا ہے۔ وہ خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرتا ہے۔ یہ خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کو دخل دیتا ہے۔ یہ ایک ہم آہنگ مجموع میں بے آہنگی کا جوڑ لگاتا ہے۔ ایک حسین تصویر میں بدصورتی کا دھبہ لگاتا ہے۔ یہ ایک کامل دنیا میں فساد برپا کرتا ہے یا ناقص چیز کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ فرشتوں کی سرگرمیوں کے ماحول میں شیطان کو سرگرم ہونے کا موقع دیتا ہے۔ پھر اشرف المخلوقات سے ہے۔ سب سے زیادہ اشرف اور افضل ہے، اور وہی سب سے کم زندگی پاتا ہے (کچھوا ۵۰۰ سال، درخت ہزار سال، لیکن انسان ۸۰-۷۰ سال زندگی پاتا ہے۔) اِس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ مختصر سی زندگی بھی ناکامیوں کی ایک مسلسل پامالی کا نام ہے۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھکر سوچے۔ موت کا احساس صرف انسان ہی کو دیا گیا ہے۔ اِسکے سوا کسی مخلوق کو نہیں دیا گیا۔

کائنات کی اسکیم

یہ کائنات ایک مرکزی اور مجموعی نقشہ کے مطابق بنی ہے۔ یہاں امن اور سکون مرکزی اور مجموعی نقشے سے مطابقت کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کامیابی کائناتی اسکیم، کائناتی منصوبے سے ہم آہنگی کی قیمت ہے ۔ اور ناکامی اس سے ہم آہنگی نہ ہونیکی قیمت ہے۔

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آتے ہیں وہ درصل اِسی خلاء کو پُر کرنیکے لئے آتے ہیں پیغمبروں کی تعلیم یہ بتلاتی ہے کہ انسان کس طرح اپنے آپ کو کائنات کی مجموعی اسکیم سے ہم آہنگ کرے کہ اور وہ کس اُسلوب حیات کو اختار کرے کہ وہ بھی خدا کی دنیامیں ایک ہرا بھرا درخت بن کر کھڑا ہو سکے۔

انسان جنگ چھیڑنے والا، انسان صنعتی کثافت سے پانی اور فضاء کو آلودہ کرنے والا، انسان کرپشن ، رشوت اور بدعنوانیوں کے ذریعے قومی معیشت کو تباہ کرنے والا ، انسان سیاسی طاقت کو فسادی طاقت میں بدلنے والا وغیرہ۔ اسلئے اصل مسئلہ نظام کو بدلنے کا نہیں ہے بلکہ انسان کو بدلنے کا ہے۔ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانا ہے۔

مذہب کا نشانہ بھی انسان کو انسان بنانا ہے ۔ انسان کی اصلاح ہو جائے تو بقیہ چیزوں کی اصلاح اپنے آپ ہو جاتی ہے۔ اسلام کا نشانہ فرد کی اصلاح ہے۔ اور اصلاح فرد کیلئے تعلیم دینی اور دنیوی ضروری ہے جن سے مسلمان دور ہیں۔

عَالَم اسلام میں شرح خواندگی (percentage of educated persons) نسبتاً کم ہے۔ اور جو لوگ پڑھے لکھے ہیں اُن کو دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا طبقہ ایسے افراد کا ہے جنہوں نے مغربی طرز زندگی کی تعلیم دنیوی تعلیمی اداروں میں حاصل کیئے ۔ یہہ طبقہ تخلیق کائنات کے مقاصد کو سمجھنے اور مظاہر فطرت کو پیغام الٰہی کی روشنی میں دیکھنے کے قاصر ہے۔

دوسرا طبقہ جو دینی مدارس میں تعلیم پاتا ہے اور جن پر جدید علوم کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ یہاں سے فارغ شدہ لوگ بھی مظاہر فطرت کو پیغام الٰہی کی روشنی میں دیکھنے سے قاصر ہیں۔

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ--- ﴾ [الأنعام:١٦٥] (اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش ہے) اس آیت میں حُسن عمل کی تلقین کے ساتھ خلافت ارضی کا تذکرہ بھی ہے ۔ اگر خلافت ارضی کا تعلق کچھ بھی مقام انسانیت اور مقصد انسانیت سے ہے تو ہمارے نظام تعلیم اور نظام ثقافت (خود ساختہ فنون کا ایک ایسا متوازن نظام) کو اس سے ہم آہنگ ہونا چاہیے ۔ چونکہ کائنات کے انتظام میں اور تسخیر فطرت (تابع کرنا) میں طرح طرح کے صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف قسم کی صلاحتیں عطا کیں ۔ اِن ہی صلاحیتوں کے ذریعے انسان کے حُسن عمل کا امتحان ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی صلاحیتوں کو روشنی دینے کیلئے علم ضروری ہے۔

قرآن اور سنت میں جہاں جہاں حصول علم کی تلقین ہے وہاں علم سے مراد بس علم ہے۔ دینی علم اور دنیوی علم کی تفریق کہیں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ اسلام کو جو علم سکھایا، وہ اشیاء اور اُن کے خواص کا علم تھا ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ

الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا--- ﴾ یہ علم سائنس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔ چنانچہ آج کے دور کی انفارمیشن ٹکنالوجی، ٹیلی کمیونیکیشن اور انجینیرنگ بھی دائرہ علم میں داخل ہے یہ کہنا غلط ہے کہ اِن معلوم کا تعلق دین سے نہیں ہے۔

علم کے ذریعے ہی حُسن عمل کا ظہور ہوتا ہے اور اس دنیا میں حُسن عمل کا اثبات (dependable) (ہر میدان میں) انتظامی اور تنظیمی (Administrative and Organizational) صلاحیتوں سے ہوتا ہے۔ ان صلاحیتوں کا ظہور فرار کی راہ اختیار کرنے سے یا ذمّہ داریوں سے دست کَشی اور گریز سے نہیں ہوتا۔

جس کائنات کے بنانے میں لاکھوں برس صرف ہوگئے ہوں اور ابتداء سے انتہاء تک جسکی تخلیق کے ہر مرحلے میں خالق کائنات کا دست تصرف کارفرما رہا ہو، کیا وہ اِس لئے ہے کہ اِس کو کافروں، مشرکوں، خدا بیزار لوگوں کے تصرف میں دیدیا جائے۔ کہ وہ لوگ اِس عظیم اشان تخلیق سے کھلواڑ کریں۔ اِسکو برباد کریں اور حق کا عَلم بلند کرنے والوں پر ظلم کرے۔ اور اسلحہ سازی اور ٹکنالوجی میں برتری کے ذریعہ مسلمانوں کے جس ملک پر چاہیں قبضہ کرلیں۔ دوسری طرف اس حد تک محدود کرلیا ہے کہ مسمانوں کا کام مسجدوں میں نماز، روزہ اور عالم دین ممبر سے عبادت کی تلقین کرے (اور عبادات کا مفہوم بھی اِسکی ناقص نظر میں اپنی تمام وسعتوں کو کھو چکا ہے) اور انتظام اور حکومت میں اور سائنس کی ترقیوں میں نہ اِس کا کوئی حصّہ ہو اور نہ عمل دخل۔ اور جب حج کا موقع آئے تو امریکہ کے جہاز میں سفر کریں پھر جدہ سے جاپان کی گاڑی میں بیٹھ کر مکّہ آئیں۔ اور ہمیں یہ احساس چھو کر بھی نہ جائے کہ ہم اپنی عبادتوں میں بھی کسی قدر

دوسروں کے محتاج ہیں۔ حالانکہ اللہ کے اطاعت گزار اور فرمانبردار بندوں کا حق اس دنیاپر نافرمان اور باغی بندوں سے کہیں زیادہ ہے اور یہ ذیل کی حدیث سے ثابت ہے۔

حدیث : فَإِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ. بے شک ساری دنیا تمھارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کیلئے پیدا کئے گئے ہو۔

اس سے پتہ چلا کہ انسان دنیا کیلئے نہیں پیدا کیا گیا ہے البتہ جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب انسان کیلئے پیدا کیا گیا ہے اور انسان اشرف اس اعتبار سے ہے کہ ساری مخلوق انسان کے تابع اور انسان خالق کے تابع ہو جائے۔ بے شک انسان کو آخرت کیلئے بنایا گیا ہے لیکن دنیا کو مزرع (farm) آخرت کہا گیا ہے۔ مزرع پر محنت کے بغیر آخرت کی فصل نہیں کاٹی جاسکتی۔ مزرع سے مراد صرف عبادت گاہ نہیں ہے بلکہ پوری زمین ہے جس کا انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے۔

حُسنِ عمل کے ذریعے اور خدا کی اطاعت کے ذریع خُلد (جنت) کو اس خاکدان ارضی پر اُتار لیا جاسکتا ہے۔ یعنی اِسکو امن اور سکون کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے۔ لیکن اس کرہ ارض پر مسلمانوں کا استحقاق (privilege) ختم ہو چکا ہے۔ اِسلئے کہ مسلمانوں میں نہ انتظامی صلاحیت ہے نہ ملکوں کے دفاع کی قابلیت ہے۔ افسوس کہ یہ دنیا جسکی تخلیق اہل ایمان کیلئے ہوئی تھی اِس کائنات پر غیروں کے سائنس دوں اور سیاست دانوں کا قبضہ ہے۔ کیوں، اسلئے کہ "یوروپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر"۔ اور جن کیلئے اسلحہ سازی کا حکم آسمان سے آیا تھا وہ بالکل خالی ہاتھ ہے۔

سورہ حدید کی ایک آیت میں کئی اہم چیزوں کی طرف اہل ایمان کو متوجہ کیا گیا ہے۔ جسکی روشنی میں نظام تعلیم کی تدوین کی جاسکتی ہے اور ان کو سامنے رکھکر فکر مدرسی کی اصلاح کر سکتے ہیں ۔اِس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "کائناتی علوم" اور "تشریعی علوم" دونوں ایک دوسرے کے معاون (مددگار) ہیں یعنی کتاب وسنت و فقہ کی طرح سائنس اور ٹکنالوجی کا علم بھی دین کا علم ہے۔ کیونکہ جس خدا نے انسانوں کیلئے پیغمبر بھیجے اور کتاب نازل کی اُسی نے انسانوں کی فلاح کیلئے لوہا نازل کیا۔ پھر قرآن کی دوسری آیت میں سامان جنگ کی تیاری یعنی ٹکنالوجی کے حصول کا حکم ہے۔جب یہ خدا کا حکم ہے تو اس سے تعلق رکھنے والے علوم، حقیر قسم کے دنیوی علوم کیونکر ہوئے ؟

مدارس کے طلباء کا یہ حال ہے کہ وہ سائنس سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مدارس کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم غیر متوازن ہے اور توازن پیدا کرنیکے لیے فکر مدارسی کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کیلئے دینی علوم کے ساتھ جدید علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ

جب سائنس اور عصر حاضر کے علوم کی تحصیل کو مضمون کا عنوان بنایا جاتا ہے تو فوراً بعض لوگوں کے ذہن میں یہ گمان آتا ہے کہ اِس سے علوم دینیہ کی اہمیت گھٹ جاتی ہے ۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ دنیا میں ناقابل تسخیر قوم بن جائیں تو انکو جدید علوم میں دست گاہ اور مہارت حاصل کرنی ہو گی ۔ مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں وقت کے علوم کی تحصیل پر توجہ دی

لیکن مسلمانوں نے اپنے دور تنزل (زوال) میں علم کو جدید اور قدیم اور دینی اور دنیوی کے خانوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اب اس تقسیم پر انکو ایسا اصرار ہے جیسے یہ بھی کوئی شرعی تقسیم ہو اور مُنَزَّل مِن اللہ ہو۔ یعنی ہر قدیم مقدس اور ہر جدید مکروہ، یہ خود ساختہ اور غلط تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس دینیہ کے فضلاء اور عصری دانش گاہوں کے فارغین کے درمیان بے گانگی کے پردے حائل ہو گئے ہیں۔ ایک زمانہ کے تقاضوں سے ناواقف اور طاقت کے سر چشمہ سے بے خبر اور دوسرا احکام دین سے ناآشنا اور ملت کے مسائل سے بیگانہ۔ ایک کے پاس کشتی نہیں جو طوفانوں کا مقابلہ کر سکے دوسروں کے پاس کشتی ہے لیکن ساحل نجات کا اسکو علم نہیں۔ اِسے کشتی نہیں ملتی اُسے ساحل نہیں ملتا۔

اب وقت آگیا ہے کہ یے خلیج کو باٹا جائے۔ دینی تعلیم کے جو مدارس ہیں اُن میں جدید علوم کو اِس حد تک ضرور داخل کیا جائے کہ مدارس عربیہ کا فارغ التحصیل (حصول تعلیم یا تربیت سے فارغ) زمانے کے تقاضوں کو سمجھ سکے اور صحیح رہبری کر سکے۔ اس طرح سے مسلمانوں کے عصری تعلیم کے اداروں میں دینی تعلیم انتی ضروری کی جائے کہ طالب علم کو حلال و حرام کا فرق معلوم ہو اور وہ اپنے اسلامی شخص کے بارے میں غیرت مند اور باحمیّت ہو۔

دلیل کم نظری ہے یہہ قصّہ جدید و قدیم

قرآن اور سیرت کے مطالعہ سے ہم کو وقت کے علوم کے حاصل کر نیکی صرف نصیحت ہی نہیں ملتی بلکہ تاکید اور تلقین ملتی ہے۔ لیکن ہمارا دین کا مطالعہ ناقص اور نقطہ نظر اسقدر محدود کہ روزہ - زکوۃ - حج کی ادائیگی ہی کو دین سمجھے ہوے ہیں۔ لیکن دفاع کیلئے قرآن میں جہاد اور بلند ترین معیاری اسلح سازی

کے احکام بھی موجود ہیں۔ جن کا تذکرہ کبھی کسی واعظ کی زبان پر نہیں آتا۔ مسلمان حکومتوں کیلئے ان پر عمل کرنا فرض ہے۔ جہاد کے صحیح تصور کو سامنے لانیکی ضرورت ہے اور فضائل نماز اور فضائل ذکر کی طرح فضائل جہاد بھی مرتب کرنیکی ضرورت ہے

مسلمانوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جدید علوم اور فنون، صنعت و حرفت اور ٹکنالوجی میں مہارت بھی دینی کام ہے اسکے بغیر مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال نہیں ہو سکتی۔ مسلمان اگر عظمت کی بازآفرینی کیلئے جدید علوم میں امامت کا مقام حاصل کرینگے تو وہ عِنداللہ ماٗجور بھی ہونگے اور دنیا میں بھی معزز ہو نگے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت مسلمانوں کیلئے ضروری ہے۔ **سائنس کیا ہے؟ اس کائنات کے بارے میں علم حاصل کرنے کا نام ہے۔ ٹیکنا لوجی کیا ہے؟ سائنسی علم اور تجربہ کو عملی صورت دینا ٹکنالوجی ہے۔** قرآن مجید میں نظام کائنات پر غور و فکر وتدبر کرنے اور آفاق اور انفس (آسمان اور انسان) کا مشاہدہ کرنیکی دعوت دیگئی ہے۔ یہی سائنس کا مفہوم ہے۔ قرآن میں طاقت اور بلند معیار کی اسلحہ سازی کا حکم ہے اور یہ سب ٹیکنالوجی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے جامع نظام کے تصور کو دین نشین کرانا علماءوں کا اور مذہبی اداروں کا کام ہے۔ خلافت ارضی کے تقاضوں کو بھی سمجھنا ہے اور سمجھانا ہے۔ واعظین اپنے وعظ کا عنوان اِسکو بنانا ضروری ہے۔ اسلام کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں کو بہتر بنانا ہے ورنہ دین کا تصور محدود ہو گا۔

ایک اچھے صاحب ایمان اور صاحب اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کیلئے جدید عُلوم سے لیس (equipped) ہونا ضروری ہے حدیث میں

حکمت اور علم کو سلمانوں کی گمشدہ میراث قرار دیا گیا ہے۔ اور اسپر مسلمانوں کا استحقاق دوسروں سے بہت زیادہ ہے۔

عبادت اور خلافت دونوں کے تقاضوں کو ہم آہنگ اور مربوط کرنا یہ مسلمان رہبر عالم کی بہت بڑی ذمّہ داری ہے۔ ورنہ اِسکی فکر ناقص اور نا مکمل ہے۔ ایمان اور علم جدید کی اِس جامعیت کے بغیر مسلمان روحانی اور مادی طاقت کے امتزاج اور ذہنی کمال اور قوت، اختراع اور عزت اور شوکت سے محروم رہنگے۔ مُسَبّبُ الاسبَاب پر بھروسہ کرنا لیکن اسباب کاانکار نہ کرنا کیونکہ یہ اسباب بھی مُسَبّبُ الاسبَاب کے پیدا کردہ ہیں اور اِن کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تقریروں میں اسباب کی نفی کرنا اور خوراق عادات قصّے سنانا۔ یہ بے عملی، خواب غفلت کا وہ انجکشن ہے جس سے مسلمان اور بھی زیادہ تَنَزُّل کا شکار ہوتے چلے جائینگے۔

سائنس اور خدا پرستی میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ سائنسی علوم خدمت خلق کا ذریعہ ہیں۔ لیکن یوروپ کی قوموں نے سائنس کو الحاد اور بے دینی کے فروغ کا ذریعہ بنالیا۔ اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنیکے درپے ہیں۔

سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

انسانوں کی طبعیت مختلف ہوتی ہیں۔ فطرت اور مزاج سب کے یکساں نہیں ہوتے، کچھ لوگوں کے مزاج میں داخلیت (حقیقت) بہت کم اور خارجیت (بیرونی طور پر ہونے والے احساسات) بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ساری دُنیا کی خبر انکو رہتی ہے اگر خبر نہیں ہے تو صرف اپنی خبر نہیں ہے۔ آج کا آدمی سب کچھ جانتا ہے نہیں جانتاہے تواپنے بارے میں، معلومات کی کمی آج کے دور میں نہیں ہے کیونکہ

ہر آدمی میں خارجیت بہت زیادہ ہے۔ ہر آدمی کے پاس داخلیت کا فقدان ہے ۔ داخلی (اندرونی) اخلاقی بیماری کی کثرت، ذہنی انتشار، عدم استقلال،، جلد بازی، شور شرابے میں اضافہ ، بے حساب حرص و طمع ، باطنی شکست (روحانی ارتقاء کا نہ ہونا) ، بے چین دل و دماغ وغیرہ۔ عہد حاضر کے بے چین اور مضطرب دل اور دماغ کو تصوّف کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے۔

تصوف تین باتوں پر مشتمل ہے۔

(۱)تلاش حق (۲) معرفت حق (۳)تذکیہ اخلاق

تلاش حق ۔ فلسفہ اور تصوف میں مشابہت اس اعتبار سے ہے کہ دونوں کے یہاں حقیقت کی جستجو پائی جاتی ہے ، مگر ایک فرق کے ساتھ کہ فلسفے نے عقل کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو (Socrates, plato & Aristotle Philosophers) کے نزدیک کائنات کا جوہر اصلی اور وجود حقیقی عقل ہے اور ہر چیز عقل کی مظہر ہے اور عالم عقل کے آگے کچھ نہیں ہے۔

عقل کی محدودیت (Limitation of wisdom)بعد کے فلسفیوں نے جیسے کانٹ (ایک جرمن فلاسفر Immanuel Kant)نے منطق اور عقل کے خلاف دلیلیں دی اور اِسکی دلیلوں سے عمل کی عمارت منہدم (مسمار) ہو گئی۔اِس کا کہنا ہے کہ عقل کو ذریعہ بنا کر خدا کے وجود کا پتہ نہیں چلا سکتے۔اسکے ذریعے نہ کائنات کی ابتداء کا پتہ چلتا ہے نہ انتہاء کا، نہ ہستی کا، نہ نیستی کا، نہ ازل کا۔

عقل کے بجائے وجدان - بعد کے دور میں برگسان Henri Bergson

نے کہا کہ حقیقت کی کھوج عقل سے نہیں بلکہ وجدان سے کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ بے وہی اور بے وجدان مادیات اور طبیعیات میں ِگھری ہوی عقل کی پہنچ حق تک نہیں ہو سکتی۔ عقل چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

فلسفہ اور تصوف کے مِزاج میں داخلیت ہے (خواہ انکی بنیاد عقل ہو یا وجدان)

منزل کی تلاش ہے۔ گہرائی ہے۔ دروں بینی ہے۔ تحلیل اور تجزیہ ہے۔ باطن شناسی ہے۔ گہرائی کے ساتھ اسباب و نتائج کی جستجو ہے۔ ایک فلسفی کی تحریر مفکرانہ ہوگی، اُسکی گفتگو میں گہرائی ہوگا۔ داخلیت کی اسقدر زیادہ اہمیت ہے کہ اسکے بغیر شخصیت میں اور تحریر اور تقریر میں وزن اور وقار پیدا نہیں ہو سکتا چونکہ موضوع حقیقت تصوف ہے اور تصرف اُس داخلیت کا نام ہے جسکے ذریعے تلاش حق اور معرفت حق ممکن ہے غور و فکر اور خاموشی کی عادت تصوف کے مزاج میں ہے۔

سائنس اور فلسفہ

فلسفی کو گہرائی کے باوجود بحث کے اندر خدانہ مل سکا۔ سائنس، فلسفہ سے الگ چیز ہے۔ اسکی دنیا محسوسات تک محدود تھی۔ خدا کی تلاش میں سائنس نے بھی رکاوٹ ڈالی تھی وہ عقلی استدلال کی منکر تھی اور عمل تجربی کی قائل تھی۔ یعنی جو چیز کہ تجربے میں نہ آتی ہو اُس کا انکار کیا گیا تھا۔ اور سائنس دان مابعد الطبیعاتی حقائق یعنی الٰہیّات یعنی (Fact of meta physics) کا مذاق اڑانے لگے تھے۔ صحیفہ آسمانی کی تلاوت کے بجائے لوگ اخبارات کے مطالعہ کو اہمیت دینے لگے تھے۔ سیاست، مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ لیکن آئین اسٹائن کا نظریہ اضافت ایسا

دھما کہ ثابت ہوا کہ مادہ بحیثیت جوہر تحلیل ہو کر رہ گیا، نفس، روح اور عقل کی اہمیت پھر سے تازہ ہو گئی۔ آئین اسٹائن نے یہ بھی کہہ دیا کہ سائنس بغیر مذہب کے لنگڑی ہے اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے۔ یہاں سے سائنس کا رُخ مادیت سے روحانیت کی طرف مُڑ گی۔ جیمس (James) فلاسفر نے کہا کہ ہمارے ذہن کی طرح ایک ابدی، آفاقی اور عالمگیر ذہن بھی موجود ہے۔ سائنس داں نے آفاقی ذہن کے نظریہ کی حمایت کی۔ اب سائنس پہلے کی طرح مذہب کی منکر نہیں رہی۔

آفاقی ذہن در اصل خدا کا دوسرا نام ہے۔ فلسفہ ہو یا سائنس، دونوں سے زیادہ سے زیادہ، انسان خدا کا قائل ہو جاتا ہے۔ لیکن معرفت اور تقرب حاصل کر لینا دوسری چیز ہے۔ تلاش حق میں سائنس اور فلسفہ دونوں تصوّف کے ہمسفر ہو سکتے ہیں، لیکن معرفتِ حق اور دوام حضور کی نعمت تصوف کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہاں تصوف سے مراد حقیقت تصوف ہے اسکو مذہبی وجدان بھی کہا جا سکتا ہے۔ وجدان کی اہمیت۔ بڑے بڑے اہل خرد وجدان کی پناہ اپنی زندگی میں لئے ہیں اور یہ اعلان کیا کہ حقیقت کی راہ تصوّف کی وادی سے ہو کر گزرتی ہے۔ اور علم کو جب تک وجدان کی کسوٹی پر بسا جائے اسوقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ امام غزالی نے اسکے لئے عقلی نبُوّی کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اقبال کہتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچے کیلئے عقل کافی نہیں ہے۔

خرد کی گتھّیاں سُلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحِب جُنوں کر

اور کبھی وہ کشمکش قلب و عقل اور کشاکش فلسفہ و وجدان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں

کبھی سوز وساز رومی کبھی پیچ وتاب رازی

کبھی سوز وساز رومی یعنی تصوّف (وجدان اور عرفان)، پیچ وتاب رازی یعنی فلسفہ (معقولات)۔

مذہبی وجدان اور عرفان کی راہ سے حق تک پہونچنے کا نام تصوّف ہے۔ بڑے بڑے فلسفی اور معقولی (عقل پر یقین کرنے والے) بھی اس وجدان کا سہارا لئے ہیں۔ سقراط (Socrates a Greek philosopher) نے اقرار کیا تھا، میں الہام سے جس میں عمل نہیں ہوتی زندگی کے اہم مواقع پر ہدایت حاصل کرتا ہوں۔ سائنس محسوسات کا نام ہے اور فلسفہ معقولات سے عبارت ہے۔ اور تصوف، حواس باطنی سے جسکو وجدان کہہ سکتے ہیں، ادراک حقیقت کا نام ہے۔

روحانی وجدان اکثر ناقابل اظہار ہوتا ہے۔ ایمان کی چاشنی جسکو حلاوۃ الامیان کہتے ہیں وہ بھی اظہار سے اونچی چیز ہے۔ اسکو الفاظ کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی طرح روحانی وجدان اور تصوف و سلوک کے مقامات اپنی حقیقت رکھتے ہیں لیکن ہمارا ذہن اتنا اُتھلا اور مزاج میں اتنی سطحیت آگئی ہے کہ غور و فکر کی عادت ختم ہو گئی۔ یہ سب داخلیات کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ ترقی باطنی کی ہمکو فکر نہیں ہے۔ صوفیہ نے اسم ذات (اللہ) کے ذکر کی تلقین اس لیے کی ہے کہ آفاق (خارج) اور انفس (نفس پرستی) میں حد سے بڑھی ہوئی مشغولیت کو جو

محبت الٰہی اور معرفت حق کے راستے میں رکاوٹ ہے کنڑول میں رکھا جائے۔
انسان تعلقات اور خواہشات دینا میں اُلجھ کر حق کے راستے سے دور ہو جاتا ہے۔
تزکیہ نفس، تزکیہ اخلاق اور سیرت کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر ہم سب کی ضرورت ہے۔

یہ ایک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف و جملہ معاونین و اہل و عیال کو اجر کثیر سے نوازے اور اس کتاب کو ان کی میزان میں حسنات کا ذخیرہ بنادے اور اس کا نفع عام فرمادے۔

مؤلف

الحاج قاری محمد ارشاد علی

مولوی عالم (نظامیہ) بی۔ کام (عثمانیہ)

ڈی۔ یف۔ ی۔ ناگپور کالج

" مولف کتاب "اصلاحی تحفہ" خادم تدریس القرآن باہتمام

باہتمام

صاحبزادہ محمد طاہر علی